

## ورپے دنیا، دین ہم رقت

ظالمانہ سیاست کا دردناک انجام

مناظر احسن گیلانی

طائف کے بعض خانوں میں ایک بازاری عورت تھی 'سمیہ' اس کا نام تھا۔ طائف کے طیبیہ حارث بن کلدہ کی وہ باندی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایران کے کسی دیہقان (قان، ۱۰) یعنی زمین دار نے شفا یابی کی خوشی میں بطور فیس کے یہی لونڈی عرب کے اس معالج حارث کو بخش دی تھی۔ حارث سمیہ کو طائف لے آیا۔ کچھ دن بعد اپنے ایک رومی غلام عبید کے ساتھ سمیہ کا عقد بھی کر دیا تھا۔ لیکن عبید کی منکوحہ ہونے کے بعد بھی سمیہ بہی یعنی (خرچی کمانے والی عورت) کا کام کرتی تھی۔ یہی کا آخری درجہ کسی عورت کے متعلق ہو تصور کیا جاسکتا ہے 'اسی حال میں یہ بے چاری جاہلیت کے زمانے میں گرفتار تھی۔

اچانک عرب میں اسلام کا آفتاب طلوع ہوا۔ زندگی کا نیا دور شروع ہوا 'پچھڑی اور گری ہوئی انسانیت اٹھنے لگی! اور کیسا اٹھان! اس سمپرس عورت کے گود ڈوں میں لپٹا ہوا لڑکا بھی اونچا ہوا۔ اونچے ہونے کے مواقع اس کے سامنے پیش ہوئے 'پیش ہوتے ہی چلے گئے۔ اس نے پردہ اٹھا لیا۔ سترہ اور اٹھارہ سال کی عمر میں وہ ایسی تقریریں کرنے لگا کہ الخطیب المصقع (ایسا مقرر جو بھی نہ تھکتا ہو) کی سند فاروقی دربارتہ حاصل ہوئی۔ (ابن عساکر، ج ۵، ص ۶۰۶)

ایران کی جنگی مہموں میں اموالِ غنیمت اور فتوحات کے متعلق حساب کتاب کا کام بھی وہی کرتا تھا 'اور فوج میں بخشش (قانس) کی خدمت اسی کے سپرد تھی۔ اس کے تقریری اور انشائی کمالات کا شہرہ بڑھتے ہوئے یہاں تک پہنچا کہ یکے بعد دیگرے مختلف گورنروں کے سیکرٹری (کاتب) ہونے کی عزت اس کو حاصل ہوئی۔ لکھا ہے کہ 'ابو موسیٰ اشعری' 'عبداللہ بن غاثر' مغیرہ بن شعبہ' 'عبداللہ بن عباس' کے سیکرٹری کا کام انجام دیتا رہا (ابن عساکر، ج ۵، ص ۷۰۷)۔ اور خلافت مرتضوی کے

دور میں تو ایران کا گورنر بن گیا۔

یہ اسی سبب کنیز کا لڑکا زیاد تھا۔ اس نے امیر معاویہؓ کے زمانے میں یہاں تک عروج حاصل کیا کہ ”حضرت معاویہؓ نے زیاد کو بصرہ و خراسان اور سجستان کا گورنر مقرر کیا۔ اس کے بعد ہند یعنی سندھ اور بحرین و عمان کی حکومت بھی اسی زیاد کے حوالے کر دی گئی“ (طبری وغیرہ ج ۵ ص ۱۳۴)

مورخین اسلام نے ایرانیوں کی طرف اس قول کو اپنی کتابوں میں منسوب کیا ہے، یعنی ”ایران والے کھاتے تھے کہ یہ عربی یعنی زیاد سسری نو شیرواں کے ساتھ اپنے چال چلن رنگ رنگ میں جتن مشابہت ہم نے ایسا آدمی نہیں دیکھا“ (طبری ج ۵ ص ۸۰)۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ جاہلیت کے زمانے کی ایک لونڈی کے بچے تک کو کج کاہہ ایران بن جانے کا موقع اسلامی دور میں مل گیا۔ اسلام کا ظور نہ ہوتا تو کون جانتا ہے کہ ایک باندی اور غلام جو بے چارے عربی النسل بھی نہ تھے، ان کے اس بچے کا انجام کیا ہوتا؟ مگر عرب کے جاہل پیچ رہتے تھے، چلا رہے تھے۔ بظاہر اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی شیطانہ کے موقع پر جب نعبہ کی چھت پر بلال حبشیؓ کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اذان دینے کا حکم ہوا تو قریش کے بعض بوڑھے سرداروں کو دیکھا گیا تھا، کہتے تھے: اچھا ہوا ان رسوائیوں کو دیکھنے کے لیے والد مرحوم زندہ نہ رہے۔“ حضرت بلالؓ کی آواز سن کر بے ساختہ ایک قریشی سردار کی زبان سے یہ فقرہ نکلا: ”محمدؐ کو اس کالے کوئے کے سوا اذان دینے کے لیے اور کوئی نہ ملا۔“ کوئی بڑبڑا رہا تھا: ”خدا کی قسم یہ بہت بڑا حادثہ ہے کہ بنی جمح والوں کا غلام (بلال) کعبہ کی چھت پر کھڑا گدھے کی طرح پیچ رہا ہے۔“ (سیرہ محمدیہ فتح مکہ)۔

مگر ان باتوں کا عادی بنانے کے لیے اسلام ظاہر ہوا تھا۔ قریشی خاتون ام المومنین زینب بنت جحشؓ کا پہلا عقد اپنے مولیٰ یعنی آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ سے رسول اللہؐ نے جس وقت کیا تھا، کوئی شبہ نہیں کہ ہزار ہا برس کے رسم و رواج کے مقابلے میں یہ بے محابا ایسی ضرب لگائی گئی تھی جس سے مکہ بن گیا، سارا عرب بن تمللا اٹھا، زمین کے ساتھ آسمان بھی بل گیا تھا۔ خود ام المومنین سیدہ زینبؓ بھی زیدؓ سے اس رشتے کو نباہ نہ سکیں اور اسی کی تلافی بھی غالباً ایک مصلحت اس نکاح کی تھی جو خود رسول اللہؐ نے حضرت زینبؓ سے کر لیا۔ لیکن وہی قریش جو پہلی دفعہ اس واقعہ کو برداشت نہ کر سکے، دیکھا گیا کہ بعد کو یکے بعد دیگرے اپنی لڑکیوں کا عقد حضرت زیدؓ بنی سے بخوشی و رضا کر رہے تھے۔ (ابولہب کی صاحبزادی درہ، عتسی کی لڑکی ام کلثوم، زبیر بن العوام کی ہمشیرہ ہند) سے حضرت زیدؓ نے عقد کیا، یہ سب کی سب قریش کے اعلیٰ خاندان کی خواتین تھیں) اور ابن شیبہ کی اگر یہ

روایت صحیح ہے..... یعنی حضرت عائشہؓ کی طرف یہ قول جو منسوب کیا گیا ہے کہ ”اگر زید“ زندہ رہ جاتے تو اپنے بعد رسول اللہؐ ”زید“ کو اپنا خلیفہ بناتے“ (اصابہ: ج ۳، ص ۳۶)۔ اور رسول اللہؐ کی زندگی میں حضرت زیدؓ کی شہادت کا سانحہ نہ پیش آجاتا تو یقیناً اسلام میں غلامی اور غلاموں کی تاریخ اس سے بھی زیادہ شاندار بہت شاندار ہوتی جتنی کہ اب ہے۔ آخر اس سے زیادہ اور کیا چاہا جا سکتا ہے کہ زیادہ جیسے آدمی کو ایران کے سرئی و نوشیرواں بن جانے تک کا موقع اسلام میں مل گیا۔ ان تین عربوں نے یہ عمدہ اس کے سپرد کیا جو چند دن پیش تر غلاموں کی مؤافی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وطنی اور نسلی مصیبت کے نشے میں جو چورتھے، ان میں یہ کیسے انقلاب تھا کہ جس شخص کی رگوں میں۔۔۔ ماں ہی کی طرف سے عربوں کا خون پہنچا تھا، اور باپ بھی جس کا سمجھا جاتا تھا کہ عربی نہیں بلکہ رومی غلام عبید نامی ہے، وہی قریشی انسل سرداروں اور عرب کے عام قبائل کا امیر بن جاتا ہے۔

مگر یہ عجیب بات ہے، اور حافظ کی کمزوری کا یہ کتنا دلچسپ مظاہرہ تھا، کہ جوں جوں اسلام کی بدولت باندی کے زینوں کو سمبہ باندی کا یہ لڑکا طے کرتا جاتا تھا، اسی نسبت سے وہ اپنی پستیوں کے پچھلے حالات کو بھولتا یا بھلاتا جاتا تھا۔ دیکھنے والوں نے اسی زیادہ کو اس حال میں دیکھا تھا کہ خچر پر سوار ہے، نگام میں بجائے چمڑے کے رسی بندھی ہوئی ہے، بدن پر اس کے پیوند دو زکرتا ہے (طبری، ج ۵، ص ۱۶۳)۔ لیکن ایک زمانہ آیا کہ وہ زیادہ لوگوں کے ساتھ دیبا یا حریر کی قبائیں، خزیا یا پلین کی چادر اوڑھے ہوئے، اس حال میں برآمد ہوتا تھا کہ آگے تیغ برہنہ تھیب اکڑکتے ہوئے، لوگوں کو راستوں سے ہناتے ہوئے چلتے تھے (طبری، ج ۵، ص ۱۴۲)۔

اس زمانے میں اس کی حسن نزاکت کی کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ سمبہ، اس کی ماں کی طرف منسوب کر کے نام لینے والوں پر بھرا جاتا۔ اتنا یہ ہے کہ سیدنا امام حسنؓ نے اپنے سفارشی خط میں زیادہ بن سمبہ کے نام سے اس کو جب مخاطب فرمایا، تو غصہ میں جواب دیتے ہوئے، بجائے حسنؓ بن علیؓ کے، حسنؓ بن فاطمہؓ کے نام سے حضرت والا کو اس نے موسوم کیا۔ اس خط میں اس نے اور بھی ایسی ناقابل بیان گستاخیوں سے کام لیا تھا کہ حضرت امیر معاویہؓ کو اس کی اطلاع امام حسنؓ کے ذریعے جب ملی، تو لکھا ہے کہ ”شام کی سرزمین امیر معاویہؓ پر تلگ ہو گئی“۔ اسی وقت غیظ و غضب سے بھرے ہوئے فرمان سے زیادہ کو آپ نے ڈانٹ بتائی، اور لکھا کہ فاطمہؓ کی طرف انتساب سے حسنؓ کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے یا کہی، اس کا بھی اندازہ غصے میں تجھے نہ ہوا۔

بیچارہ سمبہ، جس کے پیٹ سے پیدا ہونے کے انکار کی کوئی صحیحانہ نہ تھی، اس سے چاری کو تو وہ بھول بیٹھا تھا اور بھولنا کیا معنی، اس کی طرف انتساب زیادہ کے لیے ناقابل برداشت بن چکا تھا۔ مگر

جب بعض لوگوں نے امیر معاویہؓ کی حکومت کے زمانے میں یہ گواہی دی کہ طائف کے بھٹی خانے میں امیر معاویہؓ کے والد ابوسفیانؓ نے ایام جاہلیت میں زیاد کی ماں سمیہ باندی کے ساتھ بقول ابن خلدون ”جاہلیت کے نکاحوں میں سے نکاح کے کسی خاص طریقے کو اختیار کر کے تمتع حاصل کیا تھا“ (ج ۳، ص ۷) تو اس بنیاد پر وہی زیاد جو زیاد بن عبید اب تک مشہور تھا اچانک اس باپ کو بھی بھلا بیٹھا اور اپنے نام کے ساتھ زیاد بن ابی سفیان لکھنے لگا۔

دولت رسی کی مستی میں جو اپنی ماں اور باپ تک کو فراموش کر چکا، دیکھو تعجب کیجیے اگر سیدنا علیؓ کے سارے احسانات کو بھلا کر کوفہ اور بصرہ کی گورنری کے زمانے میں زیاد وہ حرکت کر گزر رہا ہو جس کا ذکر مورخین نے کیا ہے۔

اس واقعہ کا حاصل یہ ہے کہ بصرہ، کوفہ یعنی عراق اور ایران، خراسان، سجستان، سندھ، بحرین و عمان کی حکومت پر قابض ہونے کے بعد بھی زیاد کا جی نہ بھرا۔ حضرت امیر معاویہؓ کی خدمت میں اس نے یہ درخواست روانہ کی کہ ”اب خلافت کی طرف سے جو علاقے میرے سپرد کیے گئے ہیں ان علاقوں پر تو اپنے پائیں ہاتھ میں سے قابض اور مسلط ہوں، لیکن میرا دہنا ہاتھ اس وقت تک یوں ہی خالی پڑا ہوا ہے۔ اگر حجاز اور حجاز کے ساتھ یمامہ، نجد وغیرہ کے علاقے بھی مجھے سونپ دیے جائیں تو میرے دہنے ہاتھ کے لیے ایک کام نکل آئے گا“۔

ادھر تو پارگاہ خلافت میں زیاد نے یہ عرضداشت روانہ کی، ادھر اپنے خیال میں تیر کو نشانے پر بٹھانے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی کہ کوفہ میں اجتماع عام کا اعلان کیا گیا۔ زیاد کے خوف سے لوگ اتنے جمع ہوئے کہ ”مسجد اور میدان دار الامارہ کا گھن، سارے مقامات معمور ہو گئے“۔ غرض زیاد کی یہ تھی کہ وہی حضرت علیؓ ”جنہوں نے ایران کا والی بنانے کا شرف اس زیاد کو عطا فرمایا تھا“ ان کو اور ان کی ساری نوازشوں کو ان کے فضائل و کمالات کو ثبوت کبریٰ سے گونا گوں تعلقات جو حضرت والا کے تھے، سب ہی کو اپنے حافظہ سے نکال کر ”حضرت علیؓ سے تبرا اور علیحدگی کے مسئلے کو کوفہ کے باشندوں پر پیش کرے“۔ (ابن عساکر، ج ۵، ص ۲۲۱)

مطلب یہی تھا کہ قلوب میں سیدنا علیؓ کے ساتھ جو لگاؤ کوفہ والوں کا باقی تھا، اس رشتے کو بھی ختم کرائے۔ خیال یہی ہو گا کہ اس کی خبر جب دمشق میں امیر معاویہؓ کے پاس پہنچے گی، تو حجاز اور عرب کے دو سزے علاقوں کی حکومت کی درخواست پہ آسانی منظور ہو جائے گی۔

حالانکہ یہی زیاد تھا، ایران کی گورنری کے زمانے میں بھی امیر معاویہؓ کی طرف سے یہ سلسلہ جنہابی کی گئی تھی کہ وہ حضرت علیؓ کی رفاقت ترک کر کے ان کا ہم نوا بن جائے۔ لیکن اس وقت تک

حضرت علیؓ " زندہ اور برسرِ اقتدار تھے۔ جو اب میں زیاد نے کہا تھا: میں اور حضرت علیؓ کی رفاقت چھوڑ دوں؟ " میرے اور معاویہؓ کے درمیان رسول اللہؐ کے چچا (ابوطالب) کے بیٹے حضرت علیؓ ہیں " (ایضاً ص ۴۱۱)۔

مگر اب اس کا حافظہ ان ساری باتوں سے خالی ہو چکا تھا ' ایسا کیوں ہوا؟

ایران والے اسے سیاست و تدبیر میں نو شیرواں کا نمونہ اور نظیر قرار دیتے تھے۔ اپنے اقبال و عروج کے دنوں میں عرب جب اپنے بڑے سیاسی مدبروں کا ذکر کرتے تو امیر معاویہؓ ' عمرو بن عاصؓ ' مغیرہ بن شعبہؓ کے ساتھ ساتھ زیاد کا نام بھی لیتے تھے۔ ہمارے مورخین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ سیدنا حضرت علیؓ کے اچانک شہید ہو جانے کی وجہ سے آپؓ کے مقبوضہ علاقوں میں عموماً اور کوفہ و بصرہ کی چھاؤنیوں میں خصوصاً افراتفری کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ زیاد نے راستہ جو بھی اختیار کیا ہو ' لیکن اس گڑبڑ اور شور و شر کے منانے میں جو کامیابی اس کو حاصل ہوئی ' اور دیکھنے والوں نے زیاد کی حکومت کے زمانے میں جو کچھ دیکھا تھا ' شاید اس زمانے کی بڑی سے بڑی دستوری اور آئینی حکومتوں میں بھی ان تماشوں کے لیے لوگ ترستے ہی رہیں گے۔ طبری میں ہے کہ زیاد نے بطش شدید والی داروگیرت سے رنگ قائم کر دیا کہ " ہر شخص دوسرے سے اپنے آپ کو محفوظ پانے لگا۔ "

اور کیسا ' امن ' کیسی حفاظت ! طبری ہی کے الفاظ ہیں: " کسی مرد یا عورت کی کوئی چیز راستے میں گر پڑتی ' اس کے اٹھانے کی بھی جرات کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ چیز پڑی رہتی تا آنکہ جس کی چیز ہوتی وہی اس کو اٹھاتا۔ " یہ بھی تاریخ کی شہادت ہے کہ " عورتیں گھروں کے دروازوں کو بند کیے بغیر اٹیں گزارنے لگیں " (طبری ' ج ۵ ' ص ۱۲۶)

یہ ' اور اس کے سوا ' زیاد کی حکومت کی خصوصیتوں کو مورخین نے بڑے شان دار الفاظ میں بیان کیا ہے۔ دنیا کے موجودہ لادینی عہد میں زیاد بھی اسی لیے شاید ان لوگوں میں شمار ہو سکتا ہے جنہیں چاہا جائے تو حکمرانی اور جہاں بانی میں نمونہ بنایا جاسکتا ہے۔ مگر لادینی ذہنیت رکھنے والوں کی نگاہوں میں زیاد کی جتنی قدر و قیمت ہو ' میرے نزدیک تو صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لیے جس غلط راستے کو اس نے اختیار کیا تھا ' یہ راستہ ہی ایسا ہے جس میں آدمی بھولنا نہ بھی چاہے ' جب بھی ایسی ساری چیزیں اس سے بھلا دی جاتی ہیں ' جن کے متعلق سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ حافظہ سے کیسے نکل سکتی ہیں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ حکومت کی باگ ' خصوصاً جب کوفہ و بصرہ کی گورنری کا جائزہ زیاد نے لیا ' تو سب سے پہلے جو چیز اس کے دماغ سے نکل گئی ' وہ اپنے خالق اور مالک کی یاد تھی۔

منبر پر چڑھ کر وہ کہتا تھا: " خواہ کچھ ہی ہو ' لیکن مجرموں کے بدلے میں غیر مجرموں کو میں پکڑوں

گا۔

ایک مومن عرب نے کہا بھی: ”زیاد! خدا کا قانون تو یہ ہے کہ ایک کا بوجھ دوسرے پر نہ ڈالا جائے یعنی لَا تَوِزُّ وَآزِدَةٌ وَزِدْرَ أَخْرَى، کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا، فاطر (۱۸: ۳۵) لیکن تو تو خدا سے بھی بڑھ گیا۔ دھمکتا ہے کہ جس نے جرم نہیں کیا اس کو جرم کرنے والے کی جگہ پکڑے گا۔“

جواب میں زیاد نے کہا تھا: ”تم جو راہ مجھے بتا رہے ہو اب یہ راہ تمہارے سامنے نہ آئے گی‘ جب تک کہ خون کے دریا تم میں نہ بہا دیے جائیں“ (طبری ج ۵ ص ۱۲۵)

جب تک زیاد زندہ رہا، وہی کرتا رہا جو وہ کہتا تھا۔ معمولی شک و شبہ پر گردنوں کا اڑا دینا لگے وہ کوگر ادینا لوگوں کو پھانسا، جیل میں ڈال دینا، ان باتوں کی اس کی نگاہوں میں کوئی اہمیت نہ تھی۔ کہنے والوں نے تو اسی لیے یہاں تک کہہ دیا کہ مسلمانوں کے سب سے بڑے سفاک، ظالم ”حجاج کے مقتولوں کی تعداد ضرور زیادہ ہے، لیکن مسلمانوں کے بے تمہاشا قتل کرنے کی جسارت میں زیاد، حجاج سے بہت زیادہ آگے بڑھا ہوا تھا“ (ابن عساکر)

(۲)

خلاصہ یہ ہے کہ سب کچھ یاد رکھتے ہوئے، زیاد نے خدا ہی کو بھلا دینا چاہا اور اس کو بھلا دیا تھا۔ ایسی صورت میں کیوں تعجب کیجیے، اگر اس کے حافظے سے اپنی ماں سمیہ، اپنے باپ عبید اور اپنے سب سے بڑے محسن و ولی نعمت سیدنا علیؑ کی یاد نکل گئی، آخر نَسُوا اللَّهَ فَاُنْسُوا انْفُسَهُمْ انھوں نے بھلا دیا اللہ کو، بس اللہ نے بھی فراموش کر دیا، ان کو خود اپنے آپ سے (الحشر ۵۹: ۱۹)۔ یہ تو قرآن ہی کا قدرتی قانون ہے۔ خدا کو بھول جانے کے بعد زیاد درحقیقت خود اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ اس لیے نہ ماں ہی اس کو اپنی یاد دہی اور نہ باپ اور نہ بزرگوں کو وہ یاد رکھ سکا جن کی تربیت و تعلیم نے باندی کے اس بچے کو ایران و خراسان کی گورنری کے لائق بنا دیا تھا۔

اپنے آپ کو فراموش کیے ہوئے اس انسان میں برسر حکومت آنے کے بعد شاید یہ وہم پیدا ہوا کہ ”گورنر“ ہونے کے سوا نہ پہلے وہ ”اور کچھ“ تھا۔ اور تے آئندہ اسے ”اور کچھ“ ہونا ہے۔ گورنری کو اسی لیے شاید وہ اپنا پیدائشی حق یقین کرنے لگا۔ اسی لیے زمین کا وہ طویل و عریض علاقہ جو کھشتری ایران کے مقبوضہ سے بھی بڑا اور کافی بڑا تھا، ان خطوں کی حکومت بھی اس کو ناکافی نظر آنے لگی۔ آگے قدم بڑھانے کے لیے حجاز اور عرب کی عام حکومت کی ذمہ داری اس نے پیش کر دی۔ اور مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے ”اجتماع عام“ کا حکم کوفہ والوں کو اس لیے دیا کہ حضرت علیؑ سے

تبر کا اقرار ان سے لے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب سب کچھ وہ اپنے آپ ہی کو تصور کر رہا تھا اور جس نے پیدا کر کے اس قابل اس کو بنایا تھا اس کی ذمہ داریوں سے اپنی آنکھیں میچے ہوئے تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ بندر لاکھ اپنی آنکھیں بند کر لے، پھین کھولے ہوئے سانپ کا وجود تو اس کی آنکھیں بند کرنے سے معدوم نہیں ہو سکتا۔ جس خدا سے زیادتے اپنے آپ کو غافل بنایا تھا وہ اچانک اس کے سامنے آگیا۔

مورخین نے لکھا ہے کہ حجاز کے شہروں، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں یہ خبر پہنچی کہ زیاد نے وہاں کی حکومت کی خواہش امیر معاویہؓ سے کی ہے، تو لوگوں میں کافی بے چینی اور سرسراہٹ پھیل گئی۔ عمر فاروقؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے چند لوگوں کو جمع کیا۔ خود دعا کرتے جاتے تھے کہ اے پروردگار، زیاد کی معیبت میں ہم لوگوں کو مت بتلا فرما، اور دوسرے آمین کہتے تھے۔ (کامل ابن اللیث، ج ۳، ص ۱۱۱)

مدینہ منورہ میں تو یہ ہو رہا تھا۔ ادھر کوفہ میں، جہاں اجتماع عام کا حکم زیاد نے دیا تھا، کوفہ کا ہر قابل ذکر آدمی زیاد کی ڈیوڑھی کے سامنے انتہائی حیرانی اور پریشانی کے ساتھ کھڑا تھا۔ دارالامارہ سے لوگوں کو خطاب کرنے کے لیے زیاد ابھی باہر نہیں نکلا تھا، ایک صاحب، جن کا نام عبدالرحمن بن سائب تھا اور اسی مجمع میں وہ بھی شریک تھے، کہتے ہیں کہ اچانک مجھ پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ بیٹھے بیٹھے غنودگی کے اسی حال میں کیا دکھتا ہوں کہ:

بڑی لمبی چوڑی گردن اونٹ کی گردن کے مانند میرے سامنے نمایاں ہوئی، جس کے ہونٹ نکلے ہوں اور پونے بھی جس کے پھولے پھولے ہوں۔

عبدالرحمن کہتے ہیں کہ میں نے اس سے پوچھا تو کون ہے، جواب میں میں نے سنا، وہ لمبی گردن بول رہی ہے:

میں جن لینے والے کا باپ، گردن والا ہوں۔ اسی قصر (دارالامارہ) والے کے لیے اٹھایا گیا ہوں۔

اسی کے بعد غنودگی کی کیفیت کا ازالہ ہو گیا۔ ارد گرد ان کے جو لوگ تھے ان سے عبدالرحمن پوچھنے لگے، آپ لوگوں نے بھی کچھ دیکھا۔ بولے، نہیں ہمیں تو کچھ نظر نہ آیا۔ تب میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کا حال ان لوگوں سے بیان کرنے لگا۔ بیان کرتے رہا تھا کہ اچانک قصر سے ایک شخص برآمد ہوا اور اعلان کیا:

امیر (یعنی زیاد) کا حکم ہے کہ آپ لوگ چلے جائیں کیوں کہ میرے ساتھ ایک قصر پیش آگیا

ہے۔

آلام و مصائب کا سیاہ بادل تھا جو چھانے کے بعد اچانک اس امدان کے ساتھ ہی پھٹ گیا لوگ اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ ابھی مجمع رخصت بھی نہیں ہوا تھا کہ گورنر ہاؤس سے یہ خبر مجمع تک پہنچی کہ زیاد پر طاعون یا فالج کا حملہ ہو گیا ہے۔

زیاد اب صاحب فرہش تھا۔ تکلیف سخت اور بہت سخت تھی۔ کہتے ہیں کہ جس مقام پر طاعون کی گلٹی یا پھوڑا نمایاں ہوا تھا زیاد بار بار چاہتا تھا کہ بدن کے اس حصے کو نوا دے۔ آپریشن کرنے والے اس حکم کے مطابق چیر پھاڑ کے آلات اور کائے کے بعد داغنے کا سامان لے کر آ بھی گئے۔ لیکن ان لوگوں کی خاص شکل و صورت اور ان کے مسبب آلات کو دیکھ کر زیاد پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ ان کو اس نے واپس کر دیا۔ پٹنگ پر تھملا تھملا کر وٹیں بدلتا تھا اور کہتا "میں اور طاعون کا یہ پھوڑا دونوں ایک خاف کے اندر رات بھر کیسے بسر کر سکیں گے۔"

کراہ کراہ کر ساری رات گزاری۔ صبح جس وقت ہوئی تو حالات اتنے اہتر ہو چکے تھے کہ پانی کا ایک گھونٹ بھی حلق کے نیچے اتارنا فریاد کے جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ دشوار ہو چکا تھا۔ پانی منہ میں ڈالتا تھا لیکن اتے نگلی نہیں سکتا تھا کوفہ کے گورنر ہاؤس میں ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ لوگ آ رہے تھے جا رہے تھے۔

احبا اپنی تدبیروں میں مشغول تھے کہ اچانک ایک شور برپا ہوا معلوم ہوا کہ دمشق سے شہابی فرمان لے کر لوگ آئے ہیں۔ بہشیم نامی شخص 'برید کا سرگروہ تھا۔ زیاد نے حجاز ' نجد ' یمامہ ' عرب کے مذاقوں کی گورنری کی جس آرزو کو حکومت میں پیش کیا تھا اس کی منظوری کا فرمان دربار خلافت سے صادر ہوا تھا۔ زیاد درد و آرب کی شدت سے تڑپ رہا تھا کہ سرمانے پہنچ کر یہ مژدہ اس کے کانوں تک پہنچانے والے نے پہنچایا بدگورنر ہاؤس " کے دروازے پر بہشیم کھڑا ہے اس کے ساتھ وہ فرمان شہابی ہے جس میں حجاز پر تمہاری گورنری کی منظوری صادر ہوئی ہے۔"

خدا اتی جانتا ہے کہ زیاد اپنے دل میں حجاز کی حکومت کی تمنا کو کب سے پال رہا تھا۔ وہی حجاز جس میں دو سرے مقامات کے ساتھ طائف کا وہ شہر بھی تھا جہاں سببہ باندی کے پیٹ سے وہ رومی نظام حمید کے گھر پیدا ہوا تھا۔ لیکن زندگی کی یہی سب سے بڑی آرزو ہے واقعہ بن کر اس کے سامنے کھڑی ہوئی تو سنا گیا کہ زیاد دمہ رہا تھا:

"دور ہو جاؤ بہشیم! اور اپنے ساتھ جو کچھ لایا ہے اب وہ میرے کس کام کا! خدا کی قسم پانی کا ایک گھونٹ جو حلق سے نیچے اتر جائے میرے لیے بہشیم اور بہشیم اپنے ساتھ جو کچھ لایا ہے اس سے کہیں



زیادہ محبوب ہے" (ابن عساکر ' ج ۵ ' ص ۴۲۲)۔

اور اب اپنی بھلائی ہوئی حقیقت کی یاد دلانے کے بعد اس کے حافظہ میں ولہس آئی۔ اس کے سامنے اب نہ ایران تھا نہ خراسان ' نہ عراق ' نہ سندھ ' نہ بحرین اور نہ عمان۔ جو کچھ بھی تھا اس کا اندازہ اس وصیت نامے سے ہوتا ہے ' جسے ابن عساکر ہی نے حضرت امام شافعی کے حوالے سے اپنی کتاب تاریخ دمشق میں نقل کیا ہے۔ وصیت نامے کا ترجمہ یہ ہے :

اللہ کا حکم جو سامنے آچکا ہے اسی کا انتظار کرتے ہوئے ' یہ وصیت نامہ لکھوا رہا ہوں۔ حق سبحانہ و تعالیٰ کی قدرت میرے لیے ناقابل انکار بن چکی ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الہ (معبود) نہیں ہے ' وہی تھا ہے ' اس کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں ہے۔ یہ گواہی اس شخص کی ہے جو اپنے مال کو جانتا اور پہچانتا ہے۔ اور اپنے حساب و کتاب کا ذر جس پر مسلط ہے۔ میں اس کی بھی شہادت ادا کرتا ہوں کہ محمد ' اللہ کے بندے اور اللہ کے رسول ' پیغام پہنچانے والے ہیں۔ میں مسلمانوں کے امیر اور خلیفہ کو بھی ' اور عام مسلمانوں کو وصیت کرتا ہوں کہ خدا سے ڈرتے رہیں۔ "اور نہ مرے ان میں کوئی مگر اپنے آپ کو مسلمان بنائے ہوئے"۔ چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک بڑی اور چھوٹی باتوں کا خیال رکھے۔

پھر اپنی زندگی اور جن حالات سے وہ گزرا تھا ' ان ہی سے عبرت حاصل کرنے کے لیے اسی وصیت نامے میں یہ بھی لکھوایا۔

اللہ کی نعمتیں جن لوگوں کے لیے پوری کی گئی ہوں ' ان کو چاہیے کہ دنیا کو اسی جگہ پر رکھیں جو اس کا واقعی مقام ہے۔ یعنی جن لوگوں کے حقوق ان کے ذمے عائد ہوئے ہیں ' ان کو ادا کریں اور بڑے بننے کا خیال دل سے نکال دیا جائے ' کہ دنیا میں بڑے بننے کی تمنا ہی نہیں رکھی گئی ہے ' کیونکہ دنیا ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے۔ ایک راستہ ہے جس سے آدمی گزر جاتا ہے۔ بہر حال اس راستے سے گزرنے کے بعد خدا کے سامنے کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ بس اسی خدا سے میں لوگوں کو چوٹکاتا اور ڈراتا ہوں ' اور میں وصیت کرتا ہوں کہ اس گھر میں داخل ہونے سے پہلے جس سے ولہسی ناممکن ہے ' اور ولہسی کے دروازے جس گھر میں پہنچنے کے بعد بند ہو جاتے ہیں ' لوگو! ان نیکیوں کے حاصل کرنے میں جلدی کرو ' جن سے محروم ہونے والے محروم ہو کر جا رہے ہیں۔

زیادہ پر جزع فزع کی حالت طاری تھی ' اس کا مشہور بیٹا جسے حاجیہ کربلا کے کربوتوں نے رسوائے زمانہ بنا رکھا ہے وہی ابن زیاد باپ کی بلیں پر کھڑا کہہ رہا تھا: "ابا جان! آپ گھبرائیے نہیں ' میں نے

آپ کے کفن کے لیے ساتھ تھان کپڑوں کے پہلے سے فراہم کر کے رکھ لیے ہیں۔“

مطلب اس بد بخت ابن زیاد کا شاید یہ تھا کہ آپ کا جنازہ بڑے دھوم دھام سے نکالوں گا۔ چند گزوں کی جگہ جس مرنے والے کے لیے ساتھ ساتھ تھان کا انتظام صرف کفن دینے کے واسطے تیار رکھا گیا ہو اس کے لیے اور کیا کیا نہ کیا جائے گا۔ لیکن باپ ' ابن زیاد نہیں ' زیاد تھا۔ بڑے بڑوں کی صحبت اس کو میسر آئی تھی ' گو اس صحبت سے فائدہ اٹھانے کا موقع جیسا کہ چاہے اس کو نہ ملا۔ تاہم بیٹے کی طرح باپ اتنا احمق نہ تھا۔ لکھا ہے کہ جب جلا کر ابن زیاد کو زیاد نے جواب دیا:

میرے بیٹے! تیرے باپ کے سر پر وہ گھڑی آکر کھڑی ہو گئی ہے ' جس کے بعد نہیں کہا جاسکتا کہ جو لباس اس وقت اس کے بدن پر ہے ' اس سے بہتر لباس سے نوازا جائے گا ' یا یہ بھی جو کچھ ہے ' وہ بھی جلد ہی چھن جائے گا۔ (طبری ' ج ۵ ' ص ۱۲۶)

' کسی کو زیاد کے اس حال پر رحم آگیا ' اور جیسا کہ دستور ہے ' تسلی دیتے ہوئے اس نے کہا کہ ' آپ مایوس نہ ہوں ' میں آپ کو بشارت دیتا ہوں۔ بیان کیا گیا ہے ' اس وقت اس کے کمزور حافظے میں اپنی گزری ہوئی ناکردنیوں کی یاد ایک ایک کر کے جاگ رہی تھی۔ خدا ہی جانتا ہے ناحق کتنوں پر اس نے زندگی تنگ کی تھی ' اس کی گردن پر کتنے ناحق خونوں کا وبال لپٹا ہوا تھا۔ خصوصاً کوفہ کے ایک بزرگ جن کا نام ابوالمغیرہ (۱) تھا ' اس نے بلاوجہ صرف اس لیے ان کو قتل کر دیا تھا کہ عوام پر ان کا اثر ہے (۲)۔ لوگ ان کے تقویٰ ' زہد و عبادت کے معترف تھے۔ یہ فعل زیاد سے اس وقت صادر ہوا تھا جب "الامیر" یا "گورنر" ہونے کے سوا اس کے حافظے میں کسی چیز کی یاد بیدار نہ تھی۔ مگر اس وقت وہی باتیں جو اس کے دماغ میں دفن ہوتی چلی گئی تھیں ' آنکھیں مل مل کر سامنے آکر کھڑی ہو رہی تھیں۔ ان ہی میں ابوالمغیرہ کا کٹا ہوا سر بھی تھا۔ اور لو میں ڈوبا ہوا وہ جسد بھی جو تڑپ تڑپ کر اس کے سامنے ٹھنڈا ہوا تھا۔ لکھنے والے نے لکھا ہے کہ بشارت کی جھوٹی طفل تسلی کو سن کر زیاد کی زبان پر بے ساختہ یہ فقرہ جاری ہوا۔

بشارت کیسے؟ راستے پر دیکھو! ابوالمغیرہ کھڑے ہوئے ہیں۔ (ابن عساکر ' ص ۴۲۲)

دیکھا گیا کہ یہی بولتے ہوئے ' بولنے والا چپ ہو گیا اور ایسا چپ ہوا کہ پھر کسی نے اس کی کوئی آواز نہ سنی۔ تو یہ نامی کوفہ کے قبرستان میں زیاد کی لاش مٹی کے نیچے دبا دی گئی۔ بجلی کی طرح زیاد کی موت کی خبر ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔ کہتے ہیں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو جب معلوم ہوا کہ ان کی دعا قبول ہو گئی اور حجاز کا گورنر ہونے سے پہلے زیاد مر گیا ' تو فرمایا:

سیدہ کے بیٹے! لے ' نہ دنیا ہی تیرے لیے باقی رہی ' اور نہ آخرت ہی (کی راحت کو) تو پاسکا۔

ابن عمرؓ کے اس فقرے کے یہ الفاظ - "لا الدنيا بقين لك ولا الاخرة ادركت" - "تو میرے پاس دنیا باقی رہتی اور نہ ہی تجھے آخرت ملی" - سیاسی کاروبار میں زندگی گزارنے والوں کے لیے غور کیا جائے تو ایک عبرت آموز تاریخی سبق ہے۔ خودی زیاد کوفہ کے گورنر ہاؤس میں بیٹھا کرتا تھا کہ ایک بلی آئی اور کسی گوشے میں بیٹھ کر چوہے کا انتظار کرنے لگی۔ دن ختم ہو گیا، آفتاب غروب ہو رہا تھا کہ کہیں سے کوئی بد بخت چوہا نکل پڑا۔ بلی نے اسے دبوچ لیا۔ ایک صاحب جو زیاد کے ساتھ دیر تک اس تماشے کو دیکھ رہے تھے، وہی کہتے تھے کہ 'میری طرف مخاطب ہو کر زیاد نے کہا: "اس بلی سے ان لوگوں کو سبق سیکھنا چاہیے کہ جو کسی مہم کو سر کرنا چاہتے ہیں۔"

مطلب یہی تھا کہ غروب ہی کے وقت سسی، لیکن بلی بالآخر کامیاب ہو کر رہتی۔ دراصل یہ خود زیاد کی زندگی تھی۔ طبقات ابن سعد کی روایت کے مطابق "جس سال مکہ فتح ہوا، زیاد طائف میں پیدا ہوا، کوفہ میں ۵۳ھ میں اس وقت مر گیا جب کوفہ کا گورنر امیر معاویہؓ کی طرف سے تھا" (ص ۷، حصہ اول، ص ۱۷)۔

گویا زیاد کی عمر یہ مشکل ۵۴ سال ثابت ہوتی ہے اسی روایت کو مان لیا جائے کہ ہجرت کے سال وہ پیدا ہوا تو زیادہ سے زیادہ ۵۲ سال تک ہی چینی کا موقع، ماننا پڑے گا کہ اس کو ملا مگر کوفہ اور بصرہ کی گورنری کی مدت، اس کی پوری عمر خواہ ۵۲ یا ۵۳ برس کے دہے کر کل ۵ سال ہے۔ طبری نے زیاد کے غلام لیل کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ "عراق پر زیاد نے کل پانچ سال حکومت کی"۔

اس پانچ سال میں بھی زیاد جیسے سیاسی بازیگر کو، جو صحیح نتائج تک پہنچنے کے لیے اس کی قطعاً پروا نہ کرتا تھا کہ جن ذرائع کو اختیار کر رہا ہے وہ صحیح ہیں یا غلط، جو ڈٹوڑ کے سلسلے میں جن الجھنوں میں الجھتا پڑا ہو گا اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں، جو اس قسم کی غلط سیاسی زندگی کے طوفانوں میں خود کو ڈال کر ان ہی تجربات میں سے گزر رہے ہیں، جن سے زیاد گزرا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان غریبوں کو چین اور سکھ، آسودگی اور طمانیت کے چند لمحات بھی اپنی ساری جاہی بلندیوں کے باوجود نصیب ہو جائیں، تو غنیمت ہے، دوسروں کو ان غریبوں کی زندگی خواہ جس حد تک قابل رشک نظر آتی ہو، لیکن خود ان کو اپنے آپ میں دلہن ہونے کا موقع کبھی جب مل جاتا ہے، اگرچہ یہ موقع بھی ان کو بہت کم نصیب ہوتا ہے، تو ہردوسرے کی زندگی ان ہی کے لیے باعث غبط و رشک بن جاتی ہے۔

دنیا یوں ہاتھوں میں آنے کے بعد ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور دنیا کے بعد زندگی کی جو منزلیں ان کے سامنے آتی ہیں، ان میں اپنے ٹیڑھے نتائج و انجام کو ٹاہر ہے سیدھی شکلوں میں کیسے پا سکتے ہیں، گویا سیاسی پیشہ وروں ہی کے متعلق طلبہ کی تھاپ میں سننے والوں کو شاید یہ سنایا گیا تھا کہ:

درپے دنیا دین ہم رفت آں ہم رفت و ایں ہم رفت  
(دنیا حاصل کرنے کی خواہش میں 'دین ہی ہاتھ سے گیا' وہ بھی گئی 'یہ بھی گیا')

(۱) ابن مساکر کا بیان ہے کہ کوفہ کا امیر ہونے کے بعد زیاد پہلی دفعہ جب پہنچا اور دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ کوفہ والوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار ابو الصغیر کہے جاتے ہیں۔ اسی وقت ان کو طلب کر کے اس نے حکم دیا کہ میں کافی مالی معاوضہ آپ کو دوں گا۔ آپ گھرتے باہر نکلتا چھوڑ دس۔ ابو الصغیر نے کہا 'سبحان اللہ! مسلمان آدمی یہ کیسے کر سکتا ہے۔ کچھ نہیں تو نمازی کے لیے گھرتے نکلنے پر مجبور ہے۔ ماسوا اس کے مسلمانوں کی عبادت ان سے ملنے جلنے کے لیے باہر نکلتا میرا دینی فریضہ ہے۔ ساری دنیا بھی مجھے مل جائے جب بھی ان دینی امور سے دست بردار ہونے کے لیے میں تیار نہیں ہوں۔ زیاد نے کہا 'خیر ان باتوں سے میں متنع نہیں کرتا' لیکن پبلک سے کوئی تعلق نہ رکھو 'جو اب میں ابو الصغیر نے کہا کہ مسلمانوں کو بری بھلی باتوں سے آگاہ نہ کروں 'یہ بھی مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ زیاد نے کہا کہ ابو صفیر تو پھر تمہاری پناہ گاہ اب صرف کھوار ہے۔ بولے 'کھوار؟ اس سے مجھ کو کب انکار ہے۔ بد بخت نے حکم دیا اور بے چارے ابو صفیر کی گردن اڑادی گئی۔ اور یہ تو ایک تیز کی مثال ہے۔ عرض کر ہی چکا ہوں کہ حجاج کے مقتولوں کی تعداد خواہ زیاد ہو لیکن مسلمانوں کے قتل کرنے میں زیاد جتنی لاپرواہیوں سے کام لیتا تھا 'حجاج اتنا غیر محتاط نہ تھا۔

(۲) ابو صفیر کو دیکھ کر زیاد نے کہا تھا "اگر یہ بد کا تو سارا کوفہ اس کے ساتھ بدک جائے گا"۔

## قارئین کی توجہ کے لیے

ترجمان القرآن کے موجودہ دور کا پہلا 'جنوری ۹۴' کا 'شمارہ دوبارہ طبع کروایا گیا ہے۔ جن اصحاب کو اس کی ضرورت ہو' - / ۱۲ روپے فی شمارہ کے حساب سے طلب فرما سکتے ہیں۔

مینیجر ترجمان القرآن

۵ 'اے ذیلدار پارک' 'اچھرہ' لاہور